فیض احمد فیض کے شخصی مرثیے

سمیرا شفیع *
Sumera Shafi
ڈاکٹر محمد آصف اعوان **
Dr. Muhammad Asif Awan

Abstract:

"Faiz Ahmad Faiz has written only one elege on the subject of the battle of Karbala but there are three personal elegies in his poetry one on the death of his elder brother and others on the death of his friend and a soldier which depict the feeling of deep and grief. These personal elegies be side narrating the intensity of personal agony also are the beautiful amalgamation of thought and art."

فیض احمد فیض نے یوں تو ایک ہی مرثیہ واقعہ کربلا کے حوالے سے "مرثیہ امام" کے نام سے لکھا ہے، یہ مرثیہ اپنے موضوع اور اپنے اسلوب کے لحاظ سے منفرد ہے، فیض نے اپنے شعری مجموعوں میں کچھ نظمیں مرثیہ کے عنوان کے تحت لکھی ہیں: "دست تہہ سنگ" میں "دو مرثیے" نظم کا عنوان ہے، جس میں دو نظمیں "ملاقات میری" اور "ختم ہوئی بارش سنگ" کے ذیلی عنوان سے درج ہیں اسی طرح ان کے مجموعے "سر وادیٔ سینا" میں عنوان "مرثیے" کے تحت ایک قطعہ اور دو غزلیں شامل ہیں۔ "سپاہی کا مرثیہ" بھی ایک نظم کا موضوع ہے، فیض نے اپنے بھائی کے انتقال پر نوحہ کے نام سے نظم لکھی جو شخصی مرثیے کی ذیل میں شمار کی جاسکتی ہے اور "غبار ایام" مجموعے میں شامل ایک نظم بھی شخصی مرثیہ کی ایک صورت ہے۔

محمد رضا کاظمی نے اپنی کتاب "جدید اُردو مرثیہ" میں لکھا ہے:

"فیض احمد فیض نے اپنا ایک قدم مرثیہ کی وادی میں رکھ دیا ہے یہ ایک جدید شاعر کا ایک قدیم اور روایتی صنف کو خراج دینے کا ایک ذریعہ بن کے رہ سکتا ہے یا فیض

☆ پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اُردو، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد
☆☆ صدر شعبہ اُردو، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد

کے شعری سفر میں ایک اہم موڑ ثابت ہو سکتا ہے کہ فیض کا مرثیہ ہمارے لیے غورِ طلب ہے چوں کہ وہ اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس نے نظم کی تکنیک کی راہ میں بہت سی منزلیں طے کی ہیں اور نئی ہیئتوں کو موثر بنایا ہے۔"(۱)

فیض کے مرثیے باطنی اسلوب کے حامل ہیں اس لیے ان کے عناصر ترکیبی کی تلاش ایک مشکل امر ہے فیض کی اثر انگیزی کے لوزام جدید نظم سے ہم آہنگ ہیں، انہوں نے جذبات کی مناسبت سے اظہار کی ساخت کو ہمیشہ پابند رکھا ہے۔

اُٹھو اب ماٹی سے اُٹھو
جاگو میرے لال
اب جاگو میرے لال
تمری سیج سجاون کارن
دیکھو آئی رین اندھیارن
نیلے شال دوشالے لے کر
جن میں ان ڈکھین اکھین نے
ڈھیر کیے ہیں اتنے موتی
اتنے موتی جن کی جیوتی
دان سے تمرا
جگ جگ لاگا
نام چمکنے
اُٹھو اب ماٹی سے اُٹھو
جاگو میرے لال
اب جاگو میرے لال
گھر گھر بکھرا بھور کا کندن
گھور اندھیرا اپنا آنگن
جانے کب سے راہ تکتے ہیں
بالی دلہنیا بانکے ویرن
سونا تمرا راج پڑا ہے

دیکھو کتنا کاج پڑا ہے
بیری براجے راج سنگھاسن
تم ماٹی میں لال
اُٹھو ماٹی سے اُٹھو جاگو میرے لال
ہٹ نہ کرو ماٹی سے اُٹھو جاگو میرے لال
اب جاگو میرے لال(۲)

فیض کا یہ مرثیہ گیت کی ہیئت میں لکھا گیا ہے مرثیے کے اختتام پر لکھی ہوئی تاریخ اس مرثیے کا پس منظر کھول کر بیان کر رہی ہے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ پاکستان کی تاریخ کا ناقابل فراموش واقعہ ہے۔ فیض نے اس واقعے کو باطنی طور پر محسوس کیا اس کا اظہار اس مرثیے میں ملتا ہے۔ اس موقعہ پر فیض اپنی قوم کے ترجمان بن گئے تھے، فیض اپنے نوزائیدہ وطن پاکستان سے اُتنی ہی محبت کا اظہار کرتے ہیں، جتنی محبت وہ اپنے محبوبہ سے کرتے تھے، پھر اُن کا تعلق فوج سے تھا لہٰذا ایک سپاہی کی زندگی کو اُن سے بہتر اور کون جان سکتا تھا یہ مرثیہ بھی اُسی آفاقی صفت کا حامل ہے، جو ان کی انقلابی شاعری کا خاصا ہے۔

محمد رضا کاظمی اس مرثیے کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "اس مرثیے میں دو باتیں تو سامنے کی ہیں ایک تو یہ کہ قومی پس منظر میں ہونے کے باوجود اس واقعے کے خالص جذباتی اورانسانی المیہ کو پیش کیا گیا ہے اسے مرثیہ کے بجائے نوحہ کہنا زیادہ بہتر ہو گا۔ اس میں گیت کا اسلوب اپنایا گیا ہے جو صدیوں سے ہمارے یہاں بین سے مطابقت رکھتا ہے۔ یہاں زبان کا واضح تجربہ موجود ہے، فیض نے پہلی بار اُردو کے بجائے ہندی یا پوربی کا استعمال کیا ہے اور بہت روانی اور کامیابی کے ساتھ، میں خود اس زبان سے واقف نہیں لیکن محسوس کرتا ہوں کہ ایک ماں کے لہجے کی مٹھاس اور تڑپ کو اُبھارنے کے لیے وہ زبان استعمال کی گئی ہے جس کا دائرہ عمل داخلی رہا ہے اور جس میں بین کی تصویر مثالی ہو گئی ہے، فیض حزنیہ شاعری کی جس نئی جہت کی تلاش میں تھے وہ انہیں میسر ہو گئی۔"(۳)

فیض نے ایک ماں کی زبان میں جن کا جذبات کا اظہار کیا ہے وہ آفاقی اہمیت کے حامل ہیں۔ ہر ماں بیٹے کے سر پر سہرا سجائے اور اس کی پھولوں بھری سیج سجانے کی خواہش اُس کے پیدا ہوتے ہی کرنے لگتی ہے، مرثیے میں سپاہی کی دُکھی ماں اُسے مٹی سے اُٹھنے کا تقاضا کرتے ہوئے کہتی ہے کہ

تمھاری سیج کی آرائش کے لیے چاہے کالی رات ہی نمودار ہوئی ہے، مگر اس نیلی شال کو میں نے اپنی آنکھوں سے بہنے والے موتیوں سے سجادیا ہے۔ ان دکھتی آنکھوں سے اتنے آنسو بہے ہیں کہ ان کی چمک سے تمھارا نام دنیا بھر میں روشن ہو جائے گا۔ اے میرے لال !اب تو تم مٹی سے اُٹھو کیونکہ ہر گھر کا صحن نئی روشنی سے کندن کی طرح چمک رہا ہے، لیکن ہمارے گھر کے آنگن میں گھپ اندھیرا چھایا ہوا ہے۔

یہاں فیض نے ایک ماں کے جذبات کی بھرپور عکاسی صرف چند لفظوں میں نہایت کامیابی سے کی ہے کہ ماں کو اپنے گھر میں اُجالا بیٹے کی آمد اور موجودگی میں ہی محسوس ہوتا ہے اگر اُس کے بیٹے کی صورت نظر نہ آئے تو گھر بلکہ دنیا تاریکی میں ڈوبی ہوئی محسوس ہورہی ہے۔ پھر سپاہی کی ماں اپنے بیٹے کو اُٹھاتے ہوئے بتاتی ہے کہ تمھاری کم سن دلہن سوار مانوں کے ساتھ تمھاری منتظر ہے۔ تمھارے بانکے سجیلے بھائی تمھارا رستہ دیکھ رہے ہیں، تم گھر کے راجا ہو اور تمھارا گھر تمھارے بنا سونا ہو گیا ہے کتنے سارے کام ادھورے ہیں جن کو تم نے پورا کرنا ہے، تمھاری غیر موجودگی میں تمھارے دشمن اور بیری راج کرنے آبیٹھے ہیں تم اُٹھو اور ان سب کو بھاگنے پر مجبور کردو۔ اب تم مٹی سے اُٹھ جاؤ !ضد چھوڑدو میرے پیارے لال مٹی سے اُٹھ کر میرے ساتھ واپس گھر چلو

فیض نے اس مرثیے میں احساسِ غم کی جو تشریح و توضیح کی ہے اس میں مشاہدے کی رسائی نفسیاتی نکتوں کی آگاہی نے کلام میں زور بھی پیدا کیا ہے اور تاثیر بھی، فیض نے قومی غم کو ایک انفرادی ماں کے غم میں منطقی ترتیب کے تحت سمو دیا ہے اور اظہار غم کی مختلف صورتوں کو بڑے مؤثر اور دل نشین انداز میں مرثیے کا موضوع بنایا ہے۔

لو تم بھی گئے ہم نے تو سمجھا تھا کہ تم نے
باندھا تھا کوئی یاروں سے پیمان وفا اور
یہ عہد کہ تا عمر رواں ساتھ رہو گے
رستے میں بچھڑ جائیں گے جب اہل صفا اور
ہم سمجھے تھے صیاد کا ترکش ہوا خالی
باقی تھا مگر اس میں ابھی تیر قضا اور
ہر خار رہ دشت وطن کا ہے سوالی
کب آتا ہے کوئی آبلہ پا اور

آنے میں تامل تھا اگر روز جزا کو
اچھا تھا ٹھہر جاتے اگر تم بھی ذرا اور (۴)

راولپنڈی سازش کیس میں ملوث فیض کے ایک ساتھی میجر محمد اسحاق تھے، فیض اور اسحاق نے قید کے چار سال اکٹھے گزارے اور پھر یہ وہی میجر اسحاق ہیں جنھوں نے ''زندان نامہ'' کے طویل اور انتہائی مفید تعارف میں فیض کی داستانِ قید کو خاصے مفصل انداز میں بیان کیا تھا۔ میجر محمد اسحاق کو ۹ مارچ ۱۹۵۱ء کو گرفتار کیا گیا تھا فیض احمد فیض نے ایک مقالے میں میجر اسحاق کا تعارف کچھ اس طرح سے کروایا ہے:

''میجر اسحاق کو میں نے پہلے پہل ۳۸۔۱۹۳۷ء میں ایک بہت سادہ اور خاموش طبیعت لیکن بہت ذہین اور محنتی طالب علم اور شاگرد کے روپ میں دیکھا تھا، جب وہ گاؤں سے اُٹھ کر ایم۔ اے۔ او کالج امرتسر میں پڑھنے آئے تھے، اس کے بعد اب تک کتنے زمانے بدلے اور اسحاق کو کس کس رنگ میں نہیں دیکھا۔ ۱۹۴۸ء میں کشمیر کے محاذ پر فوجی افسر کی حیثیت سے جب وہ برما سے میجر بن کر اور میدان جنگ میں شجاعت کا بہت اونچا اعزاز ملٹری کراس لے کر واپس آئے تھے، پھر حیدرآباد میں جیل کے اندر راولپنڈی سازش کیس کی خفیہ عدالت کے کٹہرے میں ایک سازشی ملزم کی حیثیت سے جس نام نہاد سازش کی ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی۔ پھر اس کے نتیجے میں چار برس تک مختلف جیلوں میں ایک رفیق زنداں کی حیثیت سے اس کے بعد ایک ان تھک سیاسی کارکن، مفکر اور مزدور، کسان، ساتھی اور ہنما کے طور پر اور ساتھ ہی ساتھ ایک ہنر مند ادیب اور ڈرامہ نویس اور ایک صاحب نظر محقق اور نقاد کے طور سے اس چالیس برس سے اوپر کے طویل اور مسلسل جہاد میں کتنے تلخ امتحانوں سے گزرنا پڑا۔ کتنے مصائب اور آلام کا سامنا ہوا لیکن میجر اسحاق جیسے گنتی ہی کے لوگ ہوں گے جن کے نہ کبھی قدم لڑکھڑائے نہ ایمان ویقین میں فرق آیا اور نہ ہمت اور حوصلے میں کمی واقع ہوئی ورنہ اس دوران میں تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے۔''(۵)

''میجر اسحاق کی یاد میں'' اس عنوان کے تحت فیض کے مجموعہ ''غبارِ ایام'' میں شامل یہ نظم میجر اسحاق کا شخصی مرثیہ ہے۔ یہ شخصی مرثیہ غزل کی ہیئت میں لکھا گیا جو کہ نہایت مختصر یعنی پانچ اشعار پر مشتمل ہے۔ مرثیے کے آغاز میں فیض کہتے ہیں کہ اے دوست! تم بھی دنیا سے رخصت

ہو گئے میں نے سمجھا تھا کہ تم میرے سب سے عزیز دوست ہو تم نے تو ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا وہ عام لوگوں کی طرح کیا ہوا جھوٹا وعدہ ثابت نہیں ہو گا بلکہ یہ پائیدار بنیادوں پر استوار رشتے کی طرح مضبوط ہو گا۔ فیض نے یہاں "پیمانِ وفا" کی ترکیب سے اثر انگیزی کی کیفیت پیدا کی ہے، ساتھ ہی یہاں لفظ "بھی" کا استعمال بھی نہایت معنی خیز ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ میجر اسحاق سے پہلے بھی شاعر کا کوئی قریبی عزیز داغِ مفارقت دے چکا ہے اور شاعر ابھی اُسی سوگ میں تھا کہ میجر اسحاق بھی بچھڑ گئے۔ اگلے شعر میں شاعر نے اپنے دوست کو یاد کروایا ہے کہ تم نے کہا تھا کہ جب سب دوست ساتھ چھوڑ جائیں گے سب رشتے منہ موڑ لیں گے پھر بھی ہم ایک دوسرے کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے یہ صرف فرضی باتیں نہیں تھیں۔ ہم دونوں نے مضبوط عہد کیا تھا کہ ہمیشہ ساتھ رہیں گے مگر افسوس میں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ دشمن اب اپنے سارے تیر آزما چکا ہے، اب وہ میرا کوئی نقصان نہیں کر سکتا مگر اُس کے پاس سب سے کاری ضرب لگانے والا تیر باقی تھا جس نے ایک ہی وار میں زندگی کو شکار کر لیا۔

شاعر نے موت کو "تیر قضا" سے تشبیہ دی ہے پھر فیض کہتے ہیں کہ میجر اسحاق نے یہ ساری صعوبتیں وطن کی محبت میں برداشت کیں اور وطن کی راہوں سے ہمیشہ کانٹے چننے کو زندگی کا اولین مقصد رکھا اسی لیے اب وطن کی راہوں کے خار بھی اُن کی موت پر افسردہ ہیں کہ اب اُن کے جیسے مستقل مزاج آبلہ پا کوئی اور مسافر آئے گا بھی یا نہیں۔ آخری شعر میں فیض نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے روزِ جزا کا ایک دن مقرر کر رکھا ہے جس کے آنے میں ابھی لگتا ہے کہ کچھ وقت ہے تو تمھیں بھی چاہیے تھا کہ تم روزِ جزا کا انتظار دنیا میں ہی رہ کر لیتے اور مزید تمھارا ہمارا ساتھ رہتا مگر افسوس ایسا نہ ہو سکا اور تم بھی باقی دوستوں کی طرح خاموشی سے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ فیض نے مرثیے میں، پیمانِ وفا، اہلِ صفا، تیر قضا، آبلہ پا جیسی تراکیب استعمال کر کے مرثیے کی اثر انگیزی میں جدت پیدا کی ہے، رالف رسل نے اُردو ادب کی جستجو میں لکھا ہے:

> "اُن کے جیل کے ساتھی میجر محمد اسحاق کی یاد میں لکھی گئی نظم میں غالب کے اُس مرثیے کی بازگشت ہے جو انہوں نے اپنے انتہائی منہ بولے بیٹے عارف کی وفات پر قلم بند کیا تھا۔"(۲)

مجھ کو شکوہ ہے میرے بھائی کہ تم جاتے ہوئے
لے گئے ساتھ میری عمرِ گزشتہ کی کتاب

اس میں تو میری بہت قیمتی تصویریں تھیں
اس میں بچپن تھا میرا اور میرا عہدِ شباب
اس کے بدلے مجھے تم دے گئے جاتے جاتے
اپنے غم کو یہ دمکتا ہوا خون رنگ گلاب
کیا کروں بھائی یہ اعزاز میں کیوں کر پہنوں
مجھ سے لے لو میری سب چاک قمیصوں کا حساب
آخری بار ہے لو مان لو اک یہ بھی سوال
آج تک تم سے میں لوٹا نہیں مایوس جواب
آ کے لے جاؤ تم اپنا یہ دمکتا ہوا پھول
مجھ کو لوٹا دو میری عمرِ گذشتہ کی کتاب(۷)

یہ نوحہ فیض احمد فیض نے اپنے بڑے بھائی طفیل کے نام لکھا ہے فیض احمد فیض کو اپنے بڑے بھائی سے بہت محبت اور عقیدت تھی وہ بچپن سے ہی گھر والوں کے لاڈلے اور چہیتے تھے والد کے انتقال کی وجہ سے بھائیوں کے آپس کے تعلقات زیادہ مضبوط بنیادوں پر استوار ہو گئے تھے، ''زندان نامہ'' کے دیباچہ میں میجر محمد اسحاق نے لکھا ہے کہ:

''دیکھنے والے دیکھیں گے کہ ''دستِ صبا'' کے دوسرے حصے میں جوش وخروش کا وہ عالم نہیں جو پہلے نصف میں ہے اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ کچھ عرصہ مقدمہ کی سماعت ہو چکنے کے بعد ہمیں اُمید ہو چکی تھی کہ اگر عدالت کی کارروائی میں دلچسپی لیں تو شاید بہتری کی کوئی صورت نکل آئے اس لیے سوچ بچار نے شوریدہ سری پر سبقت لے لی تھی اس کی دوسری وجہ ان کے بھائی کی اندوہناک موت تھی وہ حیدرآباد سے اُن سے ملنے آئے تھے اور اپنے ایک روحانی پیشوا کی طرف سے اُن کی رہائی کی خوشخبری لائے تھے، ابھی حیدرآباد میں ہی تھے کہ ۱۸ جولائی ۱۹۵۲ء کو صبح کی نماز پڑھتے ہوئے اس دنیا سے رحلت کر گئے۔ فیض صاحب کو اتنا صدمہ ہوا کہ مہینوں تک نیم مردہ حالت میں رہے۔ ایک دن تو چارپائی سے اُترتے ہوئے بے ہوش ہو کر فرش پر گر پڑے آواز سُن کر میں اور عطا بھاگے بھاگے گئے اور زمین سے اُٹھا کر بستر پر لٹایا۔ یہ گھاؤ ابھی تک بھرا نہیں ہے گو انہوں نے حسبِ عادت اسے کیموفلاج (Camouflage) کر لیا ہے۔''(۸)

اس بیان سے فیض کے اس کرب کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جو اُن کو بھائی کے انتقال کی وجہ سے سہنا پڑا۔ یہ نوحہ بہت ہی ذاتی قسم کے احساسات کا ترجمان ہے یہ پانچ اشعار پر مشتمل ہے، نوحہ غزل کی ہیئت میں لکھا گیا ہے۔ اس نوحے کا سب سے بنیادی محرک تنہائی ہی ہے۔ فیض کے یہاں تنہائی ایک بنیادی جذبہ ہے، یہ ان کا زخم بھی ہے اور مرہم بھی اور یہ ان کی تمام نظموں میں شدتِ جذبات کی نشانی بھی ہے۔ جہاں غم کی جہتیں ایک سے زیادہ ہوں وہاں تنہائی عنصری حیثیت میں نہیں رہتی ہے۔ ان کے بھائی کے نوحہ میں یہ نقش گہرا نہیں چوں کہ اس نوحے میں مرکز، مذکورہ حادثے کو نہیں اس کی اہمیت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ فیض نے یادوں کا ایک سیلاب دکھایا ہے جس میں باکثرت تصویریں تیر رہی ہیں۔ فیض نے پہلے شعر میں اپنے بھائی کو مخاطب کرتے ہوئے شکوہ کیا ہے کہ تم نے اور میں نے بچپن اکٹھے گزارا تھا۔ تم چلے گئے آج بھی مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میرا بچپن اوراُس سے وابستہ یادیں سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ تم سے وابستہ کتاب میں بہت قیمتی تصویریں تھیں۔ یعنی میرا بچپن لڑکپن اور خوبصورت جوانی کے دن ان سب کے بدلے میں تم مجھے اپنی یادوں اور موت کا غم، خوبصورت پھول، سرخ گلاب کی صورت میں دے گئے ہو مگر مجھے یہ غم کا اعزاز حاصل کرنا بہت مشکل لگ رہا ہے۔ غم کی شدت میں بہت سے قمیصوں کو چاک کر چکا ہوں، اُن کا حساب لے لو۔

یہاں پورے نوحے کی کسک ایک شعر میں سامنے آتی ہے جب فیض کہتے ہیں کہ آج آخری بار میں تم سے ایک سوال کر رہا ہوں، تم سے گزارش ہے کہ مجھے مایوس نہ کرنا کیوں کہ مجھے یاد ہے کہ آج تک میں کبھی سوال کروں تو مایوس نہیں ہوا مگر یہ آخری سوال ہے کہ آکر اپنا غم واپس لے جاؤ اور مجھے میری یادوں بھری کتاب لوٹا دو کیوں کہ یہ کتاب نہیں ہے، میرے بچپن، لڑکپن، جوانی بلکہ تمام گزری ہوئی عمر کی تصویری کتاب ہے۔

اس نوحے میں جہاں یادوں کی کسک محسوس ہوتی ہے وہیں پر مرنے والے شخص کے ساتھ بیتائی ہوئی گھڑیاں اور وقت سورج کی کرنوں سے زیادہ روشن اور تابناک دکھائی دے رہا ہے۔ فیض نے اس نوحے میں غم اور دکھ کو خوب صورت دمکتے ہوئے گلاب کے پھول سے تشبیہ دی ہے جو غم سے محبت کا والہانہ اظہار ہے۔ اسی طرح صنعت تضاد کا استعمال بھی نہایت بر محل ہے یعنی سوال اور جواب۔

فیض کی کئی حزنیہ نظموں میں تنہائی اور اداسی کی تکرار ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فیض کے ہاں تنہائی اور موت کا کوئی ربط ضرور ہے۔ یہ نوحہ شخصی مرثیے کے مضامین بیان کرنے کے لیے نہایت معاون ثابت ہوا ہے فیض کی مرثیہ نگاری شخصی مرثیہ نگاری کے ذیل میں نہایت بہتر کوشش ہے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد رضا کاظمی، جدید اُردو مرثیہ، کراچی: مکتبہ ادب، ۱۹۸۱ء، ص ۱۷۱

۲۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، لاہور: مکتبہ کارواں، س ن، ص ۴۰۶

۳۔ محمد رضا کاظمی، جدید اُردو مرثیہ، ص ۱۸۵

۴۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، ص ۳۰۱

۵۔ شیما مجید، مقالات فیض، (مرتبہ)، لاہور: فیروز سنز، ۱۹۹۰ ص ۱۴۷

۶۔ رالف رسل، اُردو ادب کی جستجو، (مترجم: محمد سرمد رجا)، کراچی: انجمن ترقی اُردو، ۲۰۰۳ء، ص ۴۳۷

۷۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، ص ۱۵۳

۸۔ ایضاً، ص ۲۱۱